eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

اُردو ادب میں تہذیبی شعور کا ارتقا

DEVELOPMENT OF CULTURAL CONSCIOUSNESS IN URDU LITERATURE

Dr. Muhammad Shahbaz
Assistant Professor, Government Islamia Post Graduate College, Civil Lines Lahore

ڈاکٹر محمد شہباز
اِسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ اِسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور

ABSTRACT

There is no other opinion in this matter that the journey of human civilization spans many ages and centuries. Many motivations and factors have played a key role in the civilization of man. A writer is an active member of his society, so he cannot live in isolation from his society. This is the reason that not only he describes his civilization and culture in his works, but at the same time he also tries to preserve the salient features of his civilization forever in his works. In the article under study, scribe has tried to present the evolutionary journey of the discussion of cultural consciousness in Urdu literature in a research and critical manner.

KEYWORDS

Cultural consciousness, social life, language and literature, partition of India, Western civilization, Islamic civilization

اِس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ انسان کے تہذیب یافتہ ہونے کی منزل ہزار ہا قرنوں اور زمانوں کی مسافت طے کرنے کے بعد حاصل ہوئی۔ بلاشبہ انسان نے یہ ہفت آسماں ایک جست میں طے نہیں کیا، بل کہ اس مقام و مرتبے کے حصول کے لیے انسان نے ہزاروں سال کی تپسیا کی ہے۔ مزید یہ کہ فطرت کی ستم ظریفیوں اور حیات و زیست کی احتیاجات نے بھی انسان کو مہذب بننے میں بڑی مدد کی ہے۔ حضرتِ آدم کا زمین پر اُترنے (یا جنت سے نکالے جانے) کے بعد ستر پوشی کا اہتمام کرنا تہذیبی شعور کی جانب پہلا قدم تھا، جب کہ قابیل کا زمین کھود کر اپنے مقتول بھائی کی نعش کو سپردِ لحد کرنا بھی انسان کے مہذب سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔ پھر رفتہ رفتہ نہ صرف انسان نے فطری آفات و مصائب سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پہاڑ کھود کر پناہ گاہیں تعمیر کیں، بل کہ جنگلی و نامہذب زندگی کو ترک کر کے مساوات اور عدل و انصاف کے حامل سماج کے قیام تک

انسان نے اپنے آپ کو مہذب ہونے اہل ثابت کیا۔اس ضمن میں سیگمنڈ فرائیڈ کا یہ قول بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ تہذیب و تمدن کا اولین مطالبہ عدل وانصاف کا قیام ہے۔(۱)

قابلِ غور امر یہ ہے کہ کوئی بھی فن کار اپنے سماج سے الگ ہو کر اپنا فن تخلیق نہیں کر سکتا،وہ اس لیے کہ فن کار اپنی سماجی زندگی کے رسوم ورواج اور بود و باش سے لے کر مذہب واخلاق تک ہر شے اپنے معاشرے سے سیکھتا ہے، جس کا اظہار لا محالہ اس کی تحریروں میں ہوتا ہے ۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کوئی فن کار جہاں تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے،وہیں وہ اپنی تہذیب کے اظہار کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بناتا ہے۔بہ طور ایک تہذیب نگار کے وہ ان گلی، کوچوں، محلوں، بازاروں اور سماجی محافل میں شریک ہوتا ہے تو اس کی ملاقات عوام اور ان کے طرزِ عمل سے بھی ہوتی ہے۔یوں وہ عوام کے کے باطن میں جھانک کر ان کی پسند و ناپسند اور مزاج و روایات کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کرتا ہے،بل کہ ان کی معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کو اپنی تخلیقات کی زیب و زینت بناتا ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی ادب اور تہذیب باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں،وہ اس لیے کہ فن کار اپنی تخلیقی عمارت کی تعمیر کے لیے اپنے فن کا مسالہ یا خام مال اپنی تہذیب و معاشرت سے ہی کشید کرتا ہے۔گویا تخلیقی ادب کے لیے سماجی زندگی کا ہونا از حد نا گزیر عمل ہے،وہ اس لیے کہ فن کبھی خلا میں تخلیق نہیں ہوتا،بل کہ اس کے لیے ایک متحرک سماج کی ضرورت ہوتی ہے۔

تہذیب و ثقافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔کسی زبان کے ادبیاتِ عالیہ سے اُس کے بولنے والوں کے طرزِ زندگی ،طرزِ احساس، آدرشوں، اُمنگوں، سماجی و نفسیاتی روّیوں، عقائد وافکار اور خوابوں کا اظہار ہوتا ہے۔ادب، قوموں کی ثقافتی زندگی کے تمام رنگ اپنے اندر سمو کر اُن کے اجتماعی تشخص کا نشان بن جاتا ہے۔ہندوستان میں تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایرانی یہاں آئے تو عربوں کے اثرات کے مقابلے میں قدیم آریاؤں نے ایرانی اثرات کہیں زیادہ قبول کیے۔اُن اثرات کی حد یہ تھی کہ مقامی مسلمانوں نے اپنی مذہبی اصطلاحات تک نہ صرف قدیم ایرانی اصطلاحات سے اخذ کیں،بل کہ عربی پر قدیم فارسی اصطلاحات کو بھی آریائی ہونے کی وجہ سے ترجیح دی کہ یہ آریائی تھیں۔اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلوٰۃ کو نماز، صوم کو روزہ، اللہ کو خدا، ملائکہ کو فرشتہ اور جنت کو بہشت کہنے کی روِش عام ہو گئی۔(۲)

لاریب ہر زمانے کا ادب اُس عہد کے جملہ خدوخال کا عکاس ہوتا ہے،یہی وجہ ہے کہ ادب کے آئینے میں کسی بھی ملک یا قوم کی حیات و زیست کے تمام پہلو منعکس ہو کر جلوہ کناں ہوتے ہیں۔اِسی لیے ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کرنا ضروری ہے ۔ادب کے توسط سے ہی تاریخ کی جیتی جاگتی تصویر اور عہدِ ماضی کے کردار وافعال کا مطالعہ ممکن ہو سکتا ہے۔مختلف النوع سماجی علوم کی

مدد سے کسی بھی مخصوص عہد کے مطالعے سے یہ بات طشت از بام ہو جاتی ہے کہ اُس مخصوص دور میں کچھ خاص تصورات وعقائد اور اقدار و روایات کے پنپنے کی وجوہات کیا تھیں۔یہ الفاظِ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادب میں ''کیوں'' اور ''کیا'' کا جواب تہذیبی و تاریخی مطالعہ کی صورت میں ہی دیا جاسکتا ہے۔(۳)اِس ضمن میں سید سبطِ حسن(۱۹۱٦ء۔۱۹۸٦ء) کا کہنا ہے کہ :

> ''قومیں فنا ہو جاتی ہیں، مگر نئی نسلوں کے طرزِ معاشرت پر صنعت و حرفت پر سوچ کے انداز پر اور ادب و فن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں، لیکن ان کے الفاظ اور محاورے، علامات اور استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر ان کا جز بن جاتے ہیں۔پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے، لیکن نئے مذہب کی ہر آستین میں عمامہ ودستار کے ہر پیچ میں پرانے بت پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔تہذیبیں مٹ جاتی ہیں، لیکن ان کے نقش و نگار سے نئی تہذیب کے ایوان جگمگاتے رہتے ہیں۔''(۴)

کسی بھی ملک کی قومی زبان افرادِ قوم کے مابین محض تبادلۂ خیالات کا ہی ذریعے نہیں ہوتی، بل کہ وہ اُس قوم کی تہذیبی اقدار و روایات کی ترسیل و توسیع کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔قومی تہذیب فکری سطح پر عوام کی اُن کوششوں کے مجموعے کا نام ہے، جو وہ اُن اعمال کو بیان کرنے، حق بجانب قرار دینے اور اُن کی تعریف کرنے کے لیے کرتے ہیں، جن کی مدد سے کوئی قوم خود کو تخلیق کرتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے۔(۵)دُنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی ملک میں قومی تہذیب اُسی صورت میں پیدا ہوتی ہے، جب پورے ملک کی زبان ایک ہو، یا مقامی و علاقائی زبانوں کے جلو میں کم از کم ایک ایسی مشترک زبان ضرور جنم لے چکی ہو، اور وہ قومی وحدت کو ایک لڑی میں پرو سکے۔(٦)بلاشبہ ہر ادب اپنی تہذیبی فضا کی آواز ہوتا ہے۔(۷)امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان ہی دراصل ہماری تہذیب کا دوسرا نام ہے، اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان نے ہی ہماری تہذیب کی رُوح کو اپنے اندر سمیٹا ہوا ہے۔(۸)

تہذیب اور کلچر سے متعلق مباحث نے اُردو تنقید میں باقاعدہ موضوع کی حیثیت قیامِ پاکستان کے بعد حاصل کی، لیکن اِس سے قبل بھی اُردو ادب میں ایسی متعدد تحریریں ملتی ہیں، جن میں تہذیب و ثقافت کے بارے میں بہت اہم نکات بیان کیے گئے ہیں، جو آگے چل کر تہذیبی پس منظر کا کام دے رہے ہیں۔اِس ضمن میں ادبیاتِ اُردو میں ''تہذیب'' کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں ''تذکرۂ گلشنِ ہند'' میں کچھ اِس انداز میں ملتی ہے:

> ''غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودّب و باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔''(۹)

ازاں بعد ۱۹۰۵ء میں مولوی امانت اللہ (۱۰) نے ''اخلاقِ جلالی'' کا ترجمہ ''جامع الاخلاق'' کے نام سے کیا، جس میں اُنھوں نے لفظ ''تہذیب'' کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

''اس نے اپنے خواص مخلوقات کو زیورِ تہذیب الاخلاق سے مہذب اور عوامِ موجودات کو اُن کی تبیعت [طبیعت] سے مادّب کیا۔''(۱۱)

اِسی طرح ڈاکٹر سیموئیل جانسن (Dr. Samuel johnson)(۱۷۰۹ء۔۱۷۸۴ء) کی کتاب ''تواریخِ راسلس''(۱۸۳۹ء) مطبوعہ آگرہ کے ترجمہ کا دیباچہ، جو کبیر الدین حیدر عرف محمد میر لکھنوی سے منسوب ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''زبانِ اُردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبانِ فہم وفراست کو تہذیب اخلاق بخوبی ہو۔''(۱۲)

پیش کردہ مثالوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک زبانِ اُردو کے ادبا کے ذہن میں تہذیب کا محض وہی روایتی تصور موجود تھا، جو اُس دور میں فارسی زبان میں رائج تھا، لیکن سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) وہ پہلے ادیب تھے، جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا، جو انیسویں صدی میں اہلِ مغرب کے ہاں رائج تھا۔ سر سید نے اپنے مضامین میں تہذیب کا لفظ Civilization کے متبادل کے طور پر استعمال کیا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ سر سید کے دور میں خود اہلِ مغرب بھی Civilization کے لفظ کو کلچر کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ سر سید احمد خان نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے اُس کی اشاعتِ اوّل (۱۸۷۰ء) کے موقع پر لکھا:

''اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن، یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ، یعنی مہذّب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو، اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذّب قوم کہلاویں۔ ''سویلزیشن'' انگریزی لفظ ہے، جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے، مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں، اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعالِ ارادی، اخلاق اور معاملات، اور معاشرت اور تمدن اور طریقۂ تمدّن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا، اور اُن کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا، جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''(۱۳)

سرسید کلچر اور سویلائزیشن کے مفاہیم میں اُلجھ کر رہ گئے، لیکن اِس میں سرسید کا قصور نہیں، بل کہ اُس دور میں مغربی ادبا کے ذہنوں میں بھی کلچر اور سویلائزیشن کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ سرسید نے تہذیب کی نہ صرف جامع انداز میں تعریف کی، بل کہ تہذیب کے عناصر و عوامل کو بھی کمال چابک دستی سے پیش کیا۔ سرسید کی تمام علمی و ادبی کاوشوں میں یہ احساس نمایاں ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے مسلمانوں کی تہذیبی سطح کو بلند کر کے اُنھیں دیگر اقوام کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے۔ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' ہی میں تہذیب کے موضوع پر دو تفصیلی نوعیت کے مضامین بہ عنوان ''تہذیب اور اُس کی تعریف'' اور ''سویلزیشن یعنی شائستگی اور تہذیب'' (۱۴) بھی تحریر کیے۔ اِن مضامین میں سرسید نے کسی حد تک ''تہذیب'' کے جدید مفہوم کو پیش کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ سرسید کے اِن خیالات سے تہذیب کے جدید تصور پر کسی قدر موہوم سی روشنی بہ ہر حال ضرور پڑتی ہے۔ اُن کے مضمون ''سویلزیشن، یعنی شائستگی اور تہذیب'' کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے، تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں، اُن کی غذائیں، اُن کی پوشاکیں۔ اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات، اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں، سب یکساں ہوتی ہیں؛ اور اسی لیے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں پیدا ہوتے ہیں؛ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے؛ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سویلزیشن ہے، مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں؛ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔''(۱۵)

سرسید کے تہذیبی تصورات ۱۸۷۰ء کے بعد سامنے آئے۔ سرسید کے ہاں افادی اور عقلی نقطۂ نظر کا غلبہ دراصل مغرب کی ہی دین ہے، جسے عوام تک قابلِ قبول بنانے کا سہرا بھی اُنھی کے سر جاتا ہے۔(۱۶) حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے مغربی علوم سے اخذ و استفادہ کی جو راہ دکھائی تھی، اُس نے قریب قریب پورے اُردو ادب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔(۱۷) سرسید کی اِس تعاون کی پالیسی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے مرعوبیت کا رنگ غالب آتا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں سفرِ انگلستان کے بعد تو مغربی تہذیب کا ظاہری رُخ اُن پر مزید حاوی ہو گیا اور اُنھوں نے جب مسلمان قوم کو مغربی تہذیب اپنانے کا مشورہ دیا تو وہ اِس امر کو کلیتاً فراموش کر گئے کہ تہذیب کسی قوم کی نقالی سے پیدا نہیں ہوتی، بل کہ اُس کی تشکیل و تعمیر میں اُس قوم کے معاشی و اقتصادی عوامل، علوم و فنون اور دیگر داخلی و خارجی حالات بھی اہم

کردار ادا کرتے ہیں۔ سرسید مغرب پرستی میں اِس قدر آگے نکل گئے کہ اُنھیں مغربی تہذیب خوبیوں کا منبع اور برصغیر کی قومیں غیر مہذب نظر آنے لگیں، جس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید کے نزدیک مغربی خیالات کا حامل ہونا مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کی علامت کا درجہ اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ سرسید کو انگریزوں کے کتے بھی ہندوستانیوں سے بہتر معلوم ہونے لگے۔(۱۸) سرسید کے کُلیے (Formula) پر عمل کرنے کی کوشش میں قوم کے افراد نہ مشرقی رہے اور نہ مغربی۔ اِس ذہنی کش مکش کی بہترین مثال مولوی نذیر احمد (۱۸۳۵ء۔۱۹۱۰ء) کے ناول کا مرکزی کردار "ابن لوقت" ہے، جو فی الاصل سرسید کی اپنی ذات کا چربہ ہے۔ سرسید کے لائحہ عمل کی بنیادی خامی اُن کے عہد میں ہی محسوس کر لی گئی۔ ادبی سطح پر اِس کا اہم ترین ردِ عمل ہمیں اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء) کی صورت میں ملتا ہے۔ اکبر نے یہ خطرہ شدت سے محسوس کیا کہ سرسید مسلمانوں کو تہذیبی عروج پر پہنچانے کی سعی میں انگریزوں کے آلہ کار بن کر رہ گئے۔ مختصر یہ کہ سرسید کے ہاں قوم کو مغربی تہذیب کی تقلید کا مشورہ ملتا ہے تو اکبر کے ہاں تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے مشرق کے تہذیبی مرکز سے مضبوط تعلق استوار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔

سرسید اور اکبر کے بعد بیسویں صدی میں علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) نے اپنے تہذیبی افکار کو وسیع تر پس منظر میں پیش کیا۔ اکبر کے بعد مغربی تہذیب کی پُرزور مخالفت علامہ اقبال کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ دین و مذہب سے والہانہ شیفتگی اور عمیق مشاہدے نے اقبال کو تہذیبِ مغرب سے متنفر کر دیا، جس کا اظہار اُن کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔(۱۹) اقبال نے سرسید اور اکبر دونوں کی فکری وراثت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اپنی تخلیقی کاوِشوں میں اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی تہذیب کے رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کے خیال میں وطن اور مادہ دونوں کی اسلامی معاشرہ میں تہذیبی اہمیت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور بنیادی اہمیت روحانی اور فکری بنیادوں کو حاصل ہے۔ علامہ اقبال کی منظوم و منثور ہر دو طرح کی تصنیفات مسلمانوں کے اِسی نصب العین اور مشترک مقاصد کی بہترین توضیح کرتی ہیں۔(۲۰)

اقبال کے فوراً بعد جن نظریات نے اہمیت حاصل کی، اُن میں ترقی پسندانہ معاشرتی تصورات تھے، جن کے پسِ پردہ کارل مارکس (Karl Marx)(۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) کا فلسفہ کام کر رہا تھا۔ پھر اسلامی اساس پسندی اور ترقی پسندی ایک دوسرے کے متوازی، مگر فکری سطح پر مخالف دھاروں کے طور پر چلتے رہے۔ اِس دوران برصغیر کا سیاسی منظر نامہ بڑی سرعت سے تبدیل ہونے لگا اور آزادی کے بعد ہند اسلامی تہذیب کی بقا کا خیال نمو پانے لگا۔ اِس دوران محمد حسن عسکری (۱۹۱۹ء۔۱۹۷۸ء) کے تہذیبی تصورات نے جنم لیا۔ اِس ضمن میں بیسویں صدی کے نصف آخر سے تاحال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۳ء۔۱۹۵۹ء)، ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۰۶ء۔۱۹۸۶ء)، شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۷۳ء)، پروفیسر کرار حسین (۱۹۱۱ء۔۱۹۹۹ء)، فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء)، اختر حسین رائے پوری (۱۹۱۲ء۔۱۹۹۲ء) محمد احسن

فاروقی(۱۹۱۳ء۔۱۹۷۸ء)احمد ندیم قاسمی(۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء)،سید سبطِ حسن(۱۹۱۶ء۔۱۹۸۶ء)،مختار صدیق(۱۹۱۷ء۔۱۹۷۲ء)،سید محمد تقی(۱۹۱۷ء۔۱۹۹۹ء)،ممتاز حسین(۱۹۱۸ء۔۱۹۹۲ء)،محمد حسن عسکری(۱۹۱۹ء۔۱۹۷۸ء)،احتشام حسین(۱۹۲۲ء۔۱۹۷۲ء)،ڈاکٹر وزیر آغا(۱۹۲۲ء۔۲۰۱۰ء)انتظار حسین(۱۹۲۳ء۔۲۰۱۶ء)،جیلانی کامران(۱۹۲۶ء۔۲۰۰۳ء)،سلیم احمد(۱۹۲۷ء۔۱۹۸۳ء)،عمیق حنفی(۱۹۲۸ء۔۱۹۸۵ء)،ڈاکٹر سجاد باقر رضوی(۱۹۲۸ء۔۱۹۹۲ء)،ڈاکٹر جمیل جالبی(۱۹۲۹ء۔۲۰۱۹ء)،نظیر صدیق(۱۹۳۰ء۔۲۰۰۱ء)،پروفیسر گوپی چند نارنگ(۱۹۳۱ء۔۲۰۲۲ء)،شمیم احمد(۱۹۳۳ء۔۱۹۹۳ء)،ڈاکٹر سلیم اختر(۱۹۳۴ء۔۲۰۱۸ء)،شمس الرحمن فاروقی(۱۹۳۵ء۔۲۰۲۰ء)اور ڈاکٹر محمد علی صدیق(۱۹۳۸ء۔۲۰۱۳ء)کی تحریریں اپنی اپنی سطح پر ہماری تہذیبی راہ نمائی کر رہی ہیں۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں تہذیبی شعور کا تدریجی ارتقا اس بات کا ضامن ہے کہ اُردو ادب کے نمائندہ تخلیق کاروں نے تہذیب کے مباحث کو شعوری سطح پر نہ صرف اپنی تحریروں کا حصہ بنایا، بل کہ تہذیب کی اساسی اکائیوں کو ادب کے ساتھ یوں مدغم کر دیا کہ بعد ازاں تہذیب اور ادب ایک ہی تصویر کے دو رُخ دکھائی دینے لگے۔اس ضمن میں اس امر کا ذکر بھی از حد نا گزیر ہے کہ سر سید احمد خان نے خصوصی طور پر تہذیبی مباحث کو ادب کا جزو بنا کر اس روایت کی بیاد رکھی، جسے بعد میں اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال نے کمال خوبی سے نبھایا اور یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اُردو ادب کی یہ جان دار روایت آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سیگمنڈ فرائڈ، تہذیب اور اس کے ہیجانات، مترجم: سہیل محمود (لاہور: نگار شات، ۲۰۱۶ء، ص ۵۹

۲۔ محمد حسن، دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (دہلی: اُردو اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰

۳۔ ایضاً، ص ۱۴

٤۔ سبطِ حسن، سیّد، ماضی کے مزار (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۷ء)، ص ۵

۵۔ فرانز فینن، اُفتادگانِ خاک، مترجمین، محمد پرویز، سجاد باقر رضوی (لاہور: نگار شات، س۔ن)، ص ۲۰۹

٦۔ عابد حسین، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ (دہلی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۰۴، ۲۰۵

۷۔ محمد حسن، دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، ص ۸

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے تناظر (الٰہ آباد: اُردو رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۹ء)، ص ۸۴

۹۔ مرزا علی لطف، تذکرہ گلشنِ ہند (لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۸٦ء)، ص ۱۲۸

۱۰۔ سیّد سبطِ حسن نے اپنی تصنیف ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'' کے صفحہ ۱۴ پر مذکورہ حوالہ کے ضمن میں مولوی امانت اللہ کے بجائے مولوی عنایت اللہ لکھا ہے، جو درست نہیں۔

۱۱۔ امانت اللہ، مولوی، جامع الاخلاق (کان پور: مطبع نامی منشی نول کشور، ۱۹۰۹ء)، ص ۳

۱۲۔ بحوالہ سبطِ حسن، سیّد، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵

۱۳۔ سید احمد خاں، سر، ''مضامین اخلاقی و تمدنی''، مشمولہ، تہذیب الاخلاق (جلد دوّم)، مرتبہ: منشی محمد فضل الدین (لاہور: مصطفائی پریس، ۱۸۹۸ء)، ص ۱

۱۴۔ سر سید احمد خان نے خود اعتراف کیا ہے کہ اُن کے یہ دونوں مضامین معروف برطانوی مؤرّخ ہنری ٹامس بکل (Henry Thomas Buckle) (۱۸۲۱ء۔۱۸۶۲ء) کی کتاب "History of Civilization in England" سے ماخوذ ہیں۔

۱۵۔ سید احمد خان، سر، مقالاتِ سر سید (مجموعہ انتخاب)، مرتبہ: محمد عبداللہ خاں خویشگی (علی گڑھ: نیشنل پرنٹرس کمپنی، ۱۹۵۲ء)، ص ۵۵

۱۶۔ نظیر صدیق، تفہیم و تعبیر (ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۸۶

۱۷۔ منظر اعظمی، اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانات کا حصہ (لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۴۰

۱۸۔ سلیم احمد، مضامینِ سلیم احمد، مرتبہ: جمال پانی پتی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۵۳

۱۹۔ اشتیاق احمد، ''کلچر کے مباحث (مختصر محاکمہ)''، مشمولہ، ماہِ نو، لاہور (جلد: ۶۳، مارچ ۲۰۱۰ء)، ص ۶۲

۲۰۔ محمد اکرام، شیخ، ''ثقافتِ پاکستان'' مشمولہ، سر سیدین پاکستانی ادب (پہلی جلد)، (راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سر سیّد کالج، ۱۹۸۱ء)، ص ۵۲

۲۱۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، ادب کا تاریخی اور تہذیبی تناظر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۵